© rasailojaraid.com

نقد و نظر!

حیات مابعد (علم و بصیرت کی روشنی میں) مصنفہ سید ضامن حسین صاحب نازی گرپا۔ جہاں آبادی سائز ۲۲×۳۶/۱۶ صفحات ۲۵۶، قیمت ۳ روپے، شائع کردہ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، سعید منزل، ۲ ناظم آباد کراچی ۵

سید ضامن حسین صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جن کو اللہ نے ذہانت و فطانت سے بہرۂ وافی عطا کر کے اس زندانِ آب و گِل میں بھیجا ہے اور چونکہ ذہانت کا طبعی نتیجہ تفکر ہے۔ اس لئے ایسا شخص ہمیشہ حیات کے بنیادی مسائل میں غور و فکر کیا کرتا ہے یہ مسائل حسب ذیل ہیں

(۱) میں کون ہوں یا میں کیا ہوں؟ یعنی میری ماہیت اور حقیقت کیا ہے؟

(۲) اگر میں واجب یا قدیم ہوں تو اس پر دلیل کیا ہے؟

(۳) اگر میں ممکن یا حادث ہوں تو اس پر دلیل کیا ہے؟

(۴) اگر میں واجب ہوں تو محلِ تغیر کیوں ہوں؟ ثابت ہوا کہ میں واجب نہیں ہوں بلکہ ممکن ہوں اگر ممکن ہوں تو واجب کون ہے؟

(۵) یہ کائنات جس میں میں رہتا ہوں کیا ہے؟ واجب ہے یا ممکن؟ اگر واجب ہے تو اس میں تغیر کیوں ہے تغیر تو دلیلِ حدوث ہے ثابت ہوا کہ یہ کائنات واجب نہیں ہے۔

(۶) اگر میں بھی حادث ہوں اور یہ کائنات بھی حادث ہے تو کوئی ہستی ایسی ضرور موجود ہے جو واجب ہے جس نے مجھے اور کائنات کو موجود کیا ہے

(۷) یہ واجبہ ہستی کون ہے، (۸) اس ہستی نے مجھے کس طرح موجود کیا، (۹) میری زندگی کا مقصد کیا ہے (۱۰) میری زندگی کا انجام کیا ہے؟ کہاں سے آیا ہوں اور کہاں جاؤں گا؟ بالفاظِ دگر مرنے کے بعد دوبارہ زندگی ہوگی یا نہیں؟

جب سے دنیا میں انسان نے غور و فکر شروع کیا ہے یہ دس سوالات تین ہزار سال سے ہر ملک میں ہر زمانہ میں ہر قوم میں ذہین آدمیوں کے تفکر کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔ اور جب تک یہ دنیا قائم ہے۔ کسی نہ کسی رنگ میں ان ذہین آدمیوں کے دماغوں میں اُبھرتے رہیں گے اور انہیں بے چین کرتے رہیں گے بے چین اس لئے کرتے رہیں گے کہ بدقسمتی سے انسان کی ذہانت یا عقل یا بدھی یا فہم یا قوتِ مدرکہ ان سوالات کا صحیح جواب دینے سے قاصر ہے۔ اسی لئے عارف شیرازی نے ہمیں یہ مشورہ دیا ہے

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را

"رازِ دہر سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی عقل کی مدد سے یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ دنیا کیسے ظہور میں آئی؟ تمام حکماء اس بات پر متفق ہیں کہ یہ دنیا از خود موجود نہیں ہوئی ہے، جو کچھ نظر آتا ہے یہ حقیقت یا حقیقی نہیں ہے، بلکہ کسی حقیقت کے مظاہر ہیں جو نگاہوں سے مخفی ہے۔ افلاطون، افلاطینوس، شنکر اچاریہ، شیخ اکبر، جان اسکوٹس، کانٹ، ہیگل، شوپن ہاور اور بریڈلے سب یہی کہتے ہیں کہ کائنات حقیقی نہیں ہے، اچھا تو پھر اس کی حقیقت کیا ہے؟ وہ کون ہے جس کے مظاہر کا مجموعہ یہ کائنات ہے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ حقیقت روح ہے یا مادہ؟ مادہ کا ابطال حکیم آئنسٹائن نے اس طرح کر دیا کہ اب کوئی سائنسدان قدامتِ مادہ کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ لے دے کے ایک ہی مفروضہ باقی رہ گیا کہ کائنات روح کے مظاہر کا دوسرا نام ہے۔ لیکن سوال بدستور قائم ہے کہ روح کیا ہے؟ (۱) یہ روح، خدا ہے یا کچھ اور؟ (۲) اگر خدا ہے تو خدا نے یہ دنیا کس طرح موجود کی؟ (۳) یہ دُنیا خدا سے نکلی ہے یا اس نے اسے پیدا کیا ہے؟ (۴) اُس سے سرزد ہوئی تو کس طرح؟ (۵) اور اُس نے پیدا کی ہے تو کیسے؟ (۶) اُسے پیدا کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ (۷) اگر اُس نے پیدا کی تو ناقص کیوں کی؟ (۸) اس میں شر کیوں ہے؟ اس میں دُکھ کیوں ہے؟ ظلم و ستم کیوں ہے؟ (۹) پیدا کی تو کس چیز سے پیدا کی؟ (۱۰) کب پیدا کی؟ (۱۱) اگر ازل سے پیدا کی تو جس شے سے پیدا کی وہ بھی قدیم ہے۔ اس لئے دو قدیم ہو گئے اور تعدد قدماء محال ہے۔ (۱۲) اگر بقید زمان پیدا کی تو جب بھی پیدا کی اُس وقت کیوں پیدا کی؟ اس سے پہلے یا اس کے بعد کیوں نہ کی؟ یعنی ترجیح بلا مرجح لازم آئی جو محال ہے۔ (۱۳) خدا قدیم ہے یہ دُنیا حادث ہے۔ لہٰذا ربط الحادث بالقدیم لازم آیا جو محال ہے (۱۵) اگر واسطہ قدیم ہے تو تعدد قدماء لازم آیا اور اگر وہ حادث ہے تو پھر وہی اعتراض لازم آیا کہ حادث قدیم سے مربوط کیسے ہوا؟ (۱۶) خدا کو دُنیا بنانے کا خیال ہی کیوں آیا؟ اگر کہو کہ اپنے کمال کے اظہار کے لئے پیدا کی، تو استکمال بالغیر لازم آیا جو منافی الوہیت ہے۔ خدا محتاج ہو کر، خدا ہی نہ رہا۔ (۱۷) اگر کہو کہ وہ پیدا کرنے میں مضطر یا مجبور تھا تو اضطرار یا جبر لازم آیا۔ پھر خدا وہ ہوگا جس نے اس خدا کو تخلیق پر مجبور کیا یعنی دو خدا ہو گئے (۱۸) پیدا کرنے کے بعد خدا دُنیا سے بے تعلق ہو گیا یا تعلق ہے۔ اگر بے تعلق ہو گیا تو اب ہمیں اسے تسلیم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر تعلق ہے تو کس قسم کا تعلق ہے (۱۹) اگر تعلق کی نوعیت یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ اُس کی مشیئت اس کے ارادے اور اس کے حکم سے ہو رہا ہے، تو پھر ہم ذمہ دار نہیں ہیں، اور اگر ہم ذمہ دار ہیں، تو وہ بے تعلق ہے۔ ایک فعل کے دو فاعل نہیں ہو سکتے مثلاً راقم نے شام کو قتل کیا تو یا اپنے ارادے سے یا خدا کے ارادے سے۔ اگر اپنے ارادے سے تو خدا بے تعلق ہو گیا۔ اور اگر خدا کے ارادے سے تو راقم اس قتل کا ذمہ دار نہیں بلکہ محض آلہ یا واسطہ ہے (۲۰) خدا اگر خیر مطلق اور رحمٰن مطلق ہے تو دُکھ یا شر کہاں سے آیا؟ یعنی وہی خیر و شر کا مسئلہ جسے کوئی فلسفی آج تک حل نہیں کر سکا۔ اسی طرح جبر و اختیار کا مسئلہ بھی فہم انسانی سے بالاتر ہے اور ایک عقدہ لاینحل بنا ہوا ہے

نوٹ:۔ حکماء اور متکلمین نے جو کچھ ان دونوں مسئلوں پر لکھا ہے، وہ سب شاعری ہے اور فلسفہ اور کلام کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ انجام کار جب بات ان مسائل تک پہونچتی ہے، تو فلسفی اور متکلم دونوں شاعری کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک شاگرد نے اپنے اُستاد سے پوچھا کہ جناب جو لوگ اس دُنیا میں اندھے پیدا ہوتے ہیں۔ انہوں نے قبل پیدائش کیا قصور کیا تھا کہ وہ اندھے پیدا ہوئے؟ اُستاد نے جواب دیا "تاکہ خدا کی قدرت ظاہر ہو۔" ظاہر ہے کہ عقل اس جواب سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔ یا مثلاً ایک شاگرد نے اپنے اُستاد سے پوچھا کہ جناب اگر یہ دُنیا دار العمل ہے تو بہت سے بچے جوان ہونے سے پہلے کیوں مر جاتے ہیں اُس نے کہا "تاکہ والدین کو صبر کا اجر مل سکے" یہ بھی شاعری ہے جواب نہیں ہے

اسی لئے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ مذہب اور فلسفہ میں تطبیق کی کوشش ایک امر محال ہے، اس قسم کے تمام سوالات کا ایک ہی جواب ہے۔ کہ مشیئت ایزدی میں مجال دم زدن نہیں، چنانچہ حضرت موسیٰؑ سے اللہ کے بندے نے یہی کہا تھا کہ "مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ" میں نے جو کچھ کیا اپنے ارادے سے نہیں کیا بلکہ خدا کے حکم سے کیا یعنی بیشک اُس معصوم بچے نے کوئی قصور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں کیا تھا۔ مگر خدا نے مجھے حکم دیا کہ اُسے قتل کر دو، بالفاظِ دگر مشیت ایزدی یہی تھی کہ قبل بلوغ اس بچے کی ہستی کا چراغ گل ہو جائے (تفصیل کے لئے دیکھئے سورۂ کہف رکوع نمبر ۱۰)

اب اربابِ نظر خود فیصلہ کرلیں کہ مذہب اور فلسفہ میں تطبیق محال ہے یا نہیں؟ میری رائے میں اللہ کے مذکورہ بالا بندے کے اس جواب نے فلسفہ اور علم کلام دونوں کا خاتمہ بالخیر کر دیا، اسی لئے میرے مرشد اولین حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم نے یہ فرمایا:

رضائے حق پہ راضی رہ! یہ حرفِ آرزو کیسا؟ خدا خالق، خدا مالک، خدا کا حکم تو کیسا؟

اس ایک شعر نے ساری بحثوں کا خاتمہ کر دیا یعنی حافظ شیرازی کے اس ارشاد پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ

ع کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

بازہ آمدم بر سر مطلب، یہ مذکورہ بالا چند اعتراضات ہم نے محض بطور نمونہ اور قلم برداشتہ لکھ دیئے ہیں، ورنہ اگر مصلحۃً سخن گسترانہ بات آپڑے تو ایک سو بیس اعتراضات قلمبند کئے جا سکتے ہیں۔ میرا دعویٰ بہر حال ثابت ہو گیا کہ خدا انسان اور کائنات سے متعلق جتنے سوالات فلسفہ میں اُٹھائے گئے ہیں آج تک کسی سے ان میں سے کسی ایک سوال کا بھی شافی جواب نہیں بن پڑا۔ اور نہ قیامت تک بن سکتا ہے۔

فاضل مصنف نے اس کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندگی ہوگی، یہ سوال فلسفہ سے زیادہ مذہب میں اہمیت رکھتا ہے۔ بلکہ مذہب کا سنگِ بنیاد ہے۔ قرآن حکیم کے سوا کسی مزعومہ الہامی کتاب نے حیات بعد الممات پر دلائل قائم نہیں کئے۔ لیکن وہ سب مفید ظن ہیں نہ کہ مفید یقین، کیونکہ حیات مابعد عقل کی دسترس سے قطعاً بالاتر ہے۔ جب عقل انسانی روح انسانی ہی کا اثبات نہیں کر سکتی تو وہ اس بقاء کا اثبات کیا کر سکتی ہے اسی لئے قرآن حکیم نے عقل کے بجائے وجدان سے اپیل کی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس کے علاوہ اور کوئی صورت ممکن نہیں ہے بقائے روح کا مسئلہ شروع ہی سے مختلف اور مبحوث فیہ رہا ہے۔ اسی لئے قدیم زمانے سے دو مستقل گروہ چلے آرہے ہیں (۱) منکرین اور (۲) قائلین اور حیطۂ عقل سے تماد اور روح (نفس ملقی) کا اثبات نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح حیات بعد الموت یا بقائے روح کا مسئلہ بھی براہین عقلی سے ثابت نہیں ہو سکتا۔

قدماء میں سقراط نے اس مسئلہ پر مبہم انداز میں اظہار خیال کیا ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ خلود کا قائل تھا چنانچہ زہر کا پیالہ پینے سے پہلے جج کے سامنے جو تاریخی تقریر کی تھی اس کا خاتمہ بقول افلاطون ان الفاظ پر ہوا تھا۔

"— اور اے ججو! تمہیں بھی میری طرح خندہ پیشانی کے ساتھ موت کا خیر مقدم کرنے کے لئے آمادہ رہنا لازم ہے اور اس بات پر یقین رکھو کہ نیک آدمی کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ نہ اس دنیاوی زندگی میں اور نہ مرنے کے بعد (حیات اخروی میں)

"لیکن اب وقت ختم ہو گیا۔ اور ہم دونوں کو یہاں سے جانا ہے۔ مجھے مرنے کے لئے اور تمہیں ابھی کچھ دنوں اور زندہ رہنے کے لئے۔ اب رہی یہ بات کہ زندگی بہتر ہے یا موت! تو اس کا علم صرف خدا ہی کو ہے۔"

(۲) افلاطون نے اپنے اُستاد کی لاادریت کو تسلیم نہیں کیا۔ بلکہ خلود روح (حیات مابعد) پر آٹھ دس دلیلیں قائم کیں، جن کی بناء پر اس کا یہ خیال تھا کہ روح کی غیر فنائیت عقلی طور پر ثابت ہو سکتی ہے۔ ان میں سے وہ دلیل بہت مشہور ہے جو روح کی مفروضہ بساطت (ر ح ج ، ح ، ی ، ح و ۱۱ ، و) پر مبنی ہے افلاطون کہتا ہے کہ روح ایک جوہر بسیط ہے یعنی اس میں ترکیب نہیں پائی جاتی لہٰذا وہ ناقابل تحلیل ہے۔ اس لئے روح کا تقاضائے ذاتی یہ ہے کہ وہ مر نہیں سکتی، کیونکہ موت کسی شئی کے تحلیل ہو جانے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا دوسرا نام ہے۔

(۳) بارکلے نے بھی افلاطون کی اسی دلیل کو اختیار کیا ہے۔ چنانچہ وہ مبادیٔ علم انسانی میں لکھتا ہے۔ کہ روح چونکہ ناقابل انقسام، غیر متبدل اور غیر ممتد ہے اس لئے فساد سے محفوظ ہے ...... یعنی روح انسانی اپنی سرشت کے اعتبار سے ناقابل فنا (غیر فانی) ہے

(۴) بٹلر نے بھی اپنی مشہور تصنیف (ANALOGY) میں یہی دلیل درج کی ہے۔ (۵) ڈیکارٹ نے بھی اسی دلیل کو اصولاً تسلیم کیا ہے

(۶) افلاطون نے PHAEDO میں دوسری دلیل یہ دی ہے کہ کیا ہم اس بات کا یقین کر سکتے ہیں۔ کہ روح جس کی ماہیت اس قدر ارفع عظیم الشان پاکیزہ اور غیر مرئی ہے جسم سے جدا ہو کر فنا ہو جاتی ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے علاوہ بریں انسان کی سرشت کے اخلاقی پہلو (الوہی عنصر) کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی روح غیر فانی ہو۔

(۷) کانٹ نے تنقید عقل عملی میں اسی دلیل کو قدرے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس دلیل کے دو پہلو ہیں

پہلا یہ ہے کہ عدل کا تقاضا یہ ہے۔ کہ روح کو غیر فانی قرار دیا جائے۔ کانٹ کہتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک نکوکار روح (نکوکار انسان) کو اس کی نیکی کی جزا نہیں ملتی لیکن نیکی کی جزا ملنی چاہیئے۔ ورنہ پھر یہ دنیا غیر اخلاقی اور غیر عقلی ہو جائے گی۔ اس لئے مرنے کے بعد دوبارہ زندگی ہونی چاہیئے، جس میں نیکی کی جزا مل سکے۔ افلاطون نے بھی اپنی جمہوریت میں اسی دلیل کو پیش کیا ہے۔ اور کانٹ نے تو اس دلیل کو ہستی باری تعالیٰ کی بنیاد بنایا ہے۔ یعنی کسی ایسی ہستی کا وجود لازمی ہے جو نکوکاروں کو جزا دے سکے۔ چنانچہ کانٹ کہتا ہے کہ فرد کی بقا لازمی ہے تا کہ وہ نیکی کی جزا حاصل کر سکے۔

دلیل کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اخلاقی زندگی دراصل اس نصب العین کے لئے جد وجہد کا دوسرا نام ہے۔ جو اس محدود زندگی میں حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور وہ نصب العین "خیر کامل" ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس خیر کامل کے حصول کے لئے، فرد کی زندگی لا متناہی ہو یعنی اس کی روح ہمیشہ باقی رہے۔ تا کہ وہ غیر محدود اخلاقی ترقی کر سکے

(۸) شلر (SCHILLER) نے بھی کانٹ کے خیالات کی تائید کی ہے

(۹) انگریزی ادبیات میں ورڈسورتھ، ٹینی سن، کالرج اور براؤننگ نے بھی افلاطون اور کانٹ کے خیالات کو شاعری کا لباس پہنایا ہے جس کی تفصیل بخوف طوالت نظر انداز کی جاتی ہے

(۱۰) مجلس تحقیقات متعلق عالم ارواح کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ روح غیر فانی ہے۔ چنانچہ اس مجلس کے ایک نامور رکن سر الیور لاج نے روح کی بقا کو صاف لفظوں میں تسلیم کیا ہے۔

(۱۱) ڈاکٹر ریشڈل (RASHDALL) نے اپنے مشہور لیکچر "ابدیت روح" پر اخلاقی دلیل میں افلاطون اور کانٹ کے نقطۂ نظر سے اتفاق کیا ہے

سید صاحب نے یہ کتاب لکھ کر علم و ادب دونوں کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اور ناشرین کی علم دوستی بھی لائق ہزار تحسین ہے کہ انہوں نے اس زمانے میں جبکہ پوری قوم "مس کلچر" کی زلف گرہ گیر میں اسیر ہے اور دن رات "کلچرل شو" دیکھنے میں منہمک ہے ایسی عالمانہ کتاب شائع کر کے اردو ادب کا دامن موتیوں سے بھر دیا۔"

کتاب اول سے آخر تک غور و فکر کی دعوت دیتی ہے اور مصنف کی ژرف نگاہی اور جدت طرازی پر شاہد عدل ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مصنف نے وحدت وجود پہ جو کچھ لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے شیخ اکبرؒ اور حضرت مجددؒ کی تصانیف کا مطالعہ بہت غور سے کیا ہے چند اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں، جن سے مصنف کی اصابت رائے کا اندازہ ہو سکتا ہے

"حضرت ابن عربیؒ کے نزدیک واجب بالذات اور قدیم بالذات باریتعالیٰ ہی ہے اس لئے کائنات کی کسی شئی پر ذاتِ واجب و قدیم کا اطلاق جائز نہیں ہے ان کے نزدیک یہ کائنات بجز وجوب و قدم، باقی تمام صفات باریتعالیٰ کا مظہر ہے مگر حضرت مجدد صاحبؒ کا نقطۂ نظر شہود یہ مثالی ہے وہ ہر اعتبار سے ذات و باریتعالیٰ کو ماورائے تشبیہ و تمثیل سمجھتے ہیں کائنات کی حقیقت ان کے نزدیک سایہ کی سی ہے۔ جو نہ آفتاب کا مظہر ہوتا ہے نہ آفتاب سے جدا پایا جاتا ہے ویدانتی ہمہ اوست کے قائلوں کے نزدیک حقیقت کائنات کی مثال ایک تخم کی سی ہے۔ کہ درخت کے ذرے ذرے میں اسی کا وجود ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے نزدیک کائنات کی ہر شئے پر ذات خدا کا اطلاق جائز سمجھتے ہیں اور نہ ان کے ھم ذوق ہی اسے جائز قرار دیتے ہیں ..... اس لئے حضرت مجدد صاحبؒ نے پوری شدت کیساتھ اس نظریہ (ویدانتی ھمہ اوست) کی تردید کی۔

ویدانتی ھمہ اوست اور شیخ اکبرؒ کے پیش کردہ نظریۂ وحدت الوجود میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ شیخ اکبرؒ کا نظریہ نہ مخالفِ نظام ہے نہ خلاف شرع ہے ..... حضرت مجددؒ کے ان مکتوبات کے دیکھنے سے جن میں آپ نے نظریۂ وحدت الوجود پر تبصرہ فرمایا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں حضرت ابن عربیؒ کی ذات براہ راست آپ کے سامنے نہیں ہے۔ بلکہ بعض وہ نتائج مستخرجہ ہیں جن کی ذراسی غلط تاویل سے تمام نظام شرع و اخلاق درہم برہم ہو جاتا ہے۔ مگر جہاں تک حقیقت مطلق کی حقیقی ترجمانی کا تعلق ہے۔ وحدت وجود اور وحدت شہود ایک دریا کے ایسے دو دھارے نظر آتے ہیں، جو کچھ دور تک تو دو نظر آتے ہیں، مگر آگے بڑھ کر ایک ہو جاتے ہیں۔ حضرت ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ تمام عالم مجموعۂ اعراض ہے جو اپنی حقیقت واحدہ کے ساتھ پایا جاتا ہے، حضرت مجدد صاحب فرماتے ہیں کہ تمام کائنات مجموعہ اعراض ہے جو اپنی حقیقت واحدہ کے ساتھ ہے

اتنا تو ہر صاحب وجدان کے نزدیک مسلم ہے کہ تمام مظاہر کائنات کی اصل واحد ہے مگر اختلاف یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ وہ اصل واحد کیا ہے؟ آیا خود خدا کی ذات یا اسکی تجلی صفات؟ حضرت ابن عربیؒ اسے تجلی علم ذاتی بتاتے ہیں اور مجدد صاحبؒ اسے عکس (ظل) تجلی صفات قرار دیتے ہیں" (ص ۲۲۵ تا ص ۲۳۳)

ھمیں فاضل مصنف سے حرف بحرف اتفاق ہے کہ حضرت مجدد صاحبؒ نے شیخ اکبرؒ کے نظریۂ وحدت الوجود سے اختلاف نہیں کیا ہے بلکہ ویدانتی نظریۂ ہمہ اوست کی تردید کی ہے، شیخ اکبرؒ سے ان کا اختلاف اصولی نہیں ہے بلکہ وحدت وجود کی تعبیر میں اختلاف ہے چنانچہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ شیخ اکبرؒ کے نزدیک حقائق ممکنات وہ اسماء و صفات ہیں جو مرتبۂ علم میں متمیز ہو گئے ہیں اور حضرت مجددؒ کے نزدیک حقائق ممکنات، اسماء و صفات کے وہ عکوس ہیں، جو ان کے اعدام متقابلہ پر منطبق ہو گئے ہیں، اور ان دونوں تعبیروں میں محض ضعیف سا فرق ہے۔" (مکتوب مدنی)

خلاصۂ کلام اینکہ شیخ اکبرؒ کے نظریۂ وحدت وجود اور ویدانتی ھمہ اوست میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور حضرت مجددؒ نے اپنے مکتوبات میں ویدانتی ھمہ اوست کی تردید کی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ فاضل مصنف کی یہ کتاب، پاکستان کے تمام علمی حلقوں سے خراج تحسین وصول کرے گی۔ اور اس کے مطالعہ سے بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے گا۔

© rasailojaraid.com